R. No. 2186/57

Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date
1-8-15-22

Phone--29
Annual Rs. 4/-
Per Copy-12

جلد ۲۶ - شمارہ ۲۷ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ر جولائی ۱۹۶۷ء

اداریہ

اردو میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم پر توجہ سب سے زیادہ ضروری ہے

اردو کی بقا اور ترقی کا راز اس کی ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ منزل پر تعلیم میں ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ تعلیم کی ہر منزل میں اردو کے ذریعہ سے تعلیم پر زور دیں۔ لیکن اعلیٰ تعلیم کے لیے اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا سوال عملی طور پر اسی وقت اہم ہوگا جب ہم یہ دیکھ لیں کہ ابتدائی اور ثانوی منزل پر ان تمام طلبہ کے لیے انتظام ہے جو اردو کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے فی الحال تمام اردو دوستوں کی توجہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لیے اردو کو ذریعہ بنانے پر ہونی چاہیے۔ ہاں اعلیٰ تعلیم کے لیے مسئلے کے علمی پہلوؤں پر ہر وقت غور ہو سکتا ہے۔

اب تک یہ عام شکایت کی جاتی رہی ہے کہ ابتدائی تعلیم کے لیے حکومت یا ضلع پریشد کی طرف سے کوئی خاص انتظام نہیں ہوتا اور دس اور چالیس کا فارمولا اس طرح برتا جاتا ہے کہ ریکارڈوں میں طلبہ کا مطالبہ ہوتا ہے مگر ایک وقت میں دس اور چالیس کی شرط پوری نہیں ہوتی۔ لسانی اقلیتوں کے کمشنر نے اس کے لیے پیشگی درخواستوں کے رجسٹر رکھنے کا مشورہ دیا ہے مگر ریاستی حکومت کی غفلت کی وجہ سے رجسٹر بھی باقاعدہ نہیں رکھے جاتے۔ اس لیے اب ہماری شاخوں کا خصوصاً اور اردو دوستوں کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ طلبہ اور ان کے سرپرستوں سے درخواستیں لے کر رجسٹروں میں درج کرائیں تاکہ ابتدائی منزل پر تعلیم کا انتظام ہو۔ اس کے بعد انھیں استادوں کے تقرر اور کتابوں کی فراہمی کے سلسلے میں بھی وقت پر حکومت کو توجہ دلانی ہوگی۔

لیکن ہمیں کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حکومت کی غفلت اور مقامی حکام کی دھاندلی کی وجہ سے لوگ اتنے مایوس ہوتے جا رہے ہیں کہ درخواستیں بھی بڑی تعداد میں نہیں دی جاتیں۔ یہ غلط بات ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ مشکلات کی وجہ سے ہمت نہ ہاریں۔ اگر درخواستیں بڑی تعداد میں نہ آئیں تو ہمارے مخالف یہ کہیں گے کہ دراصل لوگ خوشی سے ہندی پڑھ رہے ہیں۔ یہ اردو اسکولوں کا مطالبہ صرف چند اردو انجمنوں کے کارکن اپنی دکان چلانے کے لیے کر رہے ہیں۔ اس لیے انجمن کی ہر شاخ، اور ہر ادبی انجمن کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے حلقے میں ابتدائی منزل پر اردو میں تعلیم کے لیے بڑی تعداد میں درخواستیں بھجوائے اور اردو میں تعلیم کا انتظام کراکے رہے۔ بعض اوقات ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اردو کے لیے بلند بانگ دعوے کرنے والے اردو کے ادیب اور شاعر اور اردو کے نام لیوا، خود اپنے بچوں کو ہندی یا انگریزی کے ذریعہ سے تعلیم دلوا رہے ہیں۔ انگریزی کے ذریعہ سے تعلیم کے ادارے بہت کم ہیں اور ان میں وہی بچے پڑھ سکتے ہیں جن کے والدین یا سرپرست خاصے خوشحال ہیں۔ عام لوگوں کے بچوں کے لیے یہاں کم ہی گنجائش ہے۔ چونکہ ان اسکولوں کا معیار اچھا ہے اس لیے ہم ان کی مخالفت نہیں کرنا چاہتے مگر یہ ضرور چاہتے ہیں کہ اگر اردو سے واقعی محبت ہے اور اس کا کچھ حق بھی ہے تو ان بچوں کے لیے جو انگریزی کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کر رہے ہیں، یا تو اسکولوں ہی میں اردو کی تعلیم کا بھی انتظام کرایا جائے یا والدین گھر پر انھیں اردو پڑھائیں۔ جو والدین اس بنیاد کو نظر انداز کر دیتے ہیں وہ اپنی زبان کے ساتھ بڑی زیادتی کرتے ہیں۔ بچے کو اگر ابتدا ہی میں اردو نہ پڑھائی گئی تو بعد میں اس کے لیے اس سے دلچسپی رکھنا بہت مشکل ہوگا۔ پھر وہ علم کا پتلا بن جائے گا۔ اپنے ماحول اور اپنی تہذیب سے بیگانہ رہے گا۔ اس لیے جو لوگ اپنے بچوں کی انگریزی اسکولوں میں تعلیم کا خرچ برداشت کر سکتے ہیں وہ اگر اپنی زبان کے بارے میں مخلص ہیں تو اردو پڑھانے کے لیے مناسب انتظام بھی کر سکتے ہیں۔ اور اگر نہ کریں تو پھر ان کی اردو سے محبت کے کوئی معنی نہیں۔

رہا ہندی اسکولوں کا سوال تو یہ عام اسکول ہیں۔ ہندی کے علاقوں میں ہندی زبان سے آشنا ہونا اور دوسری علاقائی زبانوں کے علاقوں میں وہاں کی سرکاری زبان سے آشنا ہونا ضروری ہے۔ مگر یہاں بھی بنیاد کو صحیح رکھنے کے لیے اردو کے ذریعہ سے تعلیم پر اصرار کرنا چاہیے اور اگر حکومت کی طرف سے انتظام نہ ہو تو اپنے اسکول کھولنے چاہئیں۔ مگر کسی حال میں بنیادی تعلیم ہندی کے ذریعہ سے یا کسی اور علاقائی سرکاری زبان کے ذریعہ سے دینے پر راضی نہیں ہونا چاہیے۔ ابتدائی تعلیم ہر حال میں مادری زبان کے ذریعہ سے دی جانی چاہیے۔ اس سلسلے میں ان اسکولوں کے معیار پر بھی توجہ ضروری ہے۔ اگر اردو اسکول میں تمام مضامین کی پڑھائی کا اچھا انتظام نہ ہو تو ایسے اسکول کے ذریعہ سے اردو کی کیا خدمت ہوگی اور بچے کی صلاحیت کس طرح ابھر سکے گی۔ اس لیے اردو کے سلسلے میں دوسرے پہلوؤں پر اتنا زور ضروری نہیں جتنا ابتدائی تعلیم پر ضروری ہے۔ اردو دوست جہاں دل و جان سے اس طرف متوجہ ہوئے ہیں وہاں یہ کام اچھا خاصا ہو رہا ہے۔ مگر جہاں وہ صرف حکومت

پر تکیہ کئے بیٹھے ہیں۔ وہاں ظاہر ہے کہ وقت گزرتا جا رہا ہے اور ہماری نئی نسلیں صحیح تربیت سے محروم ہوتی جا رہی ہیں۔ (باقی آئندہ)

انوار اقبال شایع ہوگئی

یہ کتاب علامہ اقبال کے صرف ان خطوط، مضامین، تقاریظ اور اشعار پر مشتمل ہے جو یا تو سرے سے کہیں شایع ہی نہیں ہوئے یا اگر شایع ہوئے بھی ہیں تو کسی باقاعدہ مجموعہ میں شامل نہیں۔

مکتوبات کے سلسلے میں سید یامین ہاشمی، سید نذیر احمد ہاشمی، سردار رب نواز خاں، خواجہ عبدالوحید، نصر اللہ خاں، غلام بھیک نیرنگ، سعید نفیسی، پیرزادہ ابراہیم حنیف، مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی اور بہت سے دیگر حضرات کے نام اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط پہلی مرتبہ اس کتاب میں شایع کئے گئے ہیں۔

اقبال کے نایاب مضامین اور متفرق تحریروں کے علاوہ چند نادر دستاویزات کے عکس بھی شامل کتاب ہیں۔

کتاب کے مرتب بشیر احمد ڈار ہیں۔

قیمت بارہ روپے

مشتاق بک ڈپو نزد اردو کالج شیلڈن کراچی مغربی پاکستان سے مل سکتی ہے۔

بی بی سی کی عالمی سروس کے لیے مختصر افسانوں کی ضرورت

لندن۔ بی بی سی نے گذشتہ سال مختصر افسانوں کا مقابلہ منعقد کیا تھا جو بہت کامیاب رہا تھا۔ اس مقابلے کے لیے افسانہ نویسوں نے اپنی ۸۰۰۰ کہانیاں بھیجی تھیں۔ دو ہندوستانی افسانہ نویس جناب ہرچیس دوست اور مسز گوپی کا پا "انعام یافتگان" میں سے تھے ان کو بیس پونڈ کا انعام دیا گیا تھا۔

بی بی سی نے افسانہ نویسوں کو پھر دعوت دی ہے۔ کہ وہ کہانیاں بھیجیں ہر قبول شدہ کہانی کا مناسب معاوضہ دیا جائے گا اور کہانیاں عالمی سروس میں نشر کی جائیں گی کہانی طبع زاد اور غیر مطبوعہ ہونی چاہیے اور اس کے الفاظ تیرہ سو اور اٹھارہ سو کے درمیان ہونی چاہئیں۔

کہانیاں مندرجہ ذیل پتہ پر بھیجی جائیں۔

شارٹ اسٹوری۔ بی بی سی ورلڈ سروس بش ہاؤس۔ لندن۔ ڈبلیو سی ۲

مجاز کی زندگی اور شاعری پر ایک کتاب
مجاز ایک آہنگ

کراچی۔ شاعر شہر نگاراں اسرار الحق مجاز مرحوم کی زندگی شاعری اور شخصیت پر ایک مبسوط کتاب "مجاز ایک آہنگ" جو مدت دراز سے نایاب تھی بابائے اردو کے قلمی پیش لفظ کے ساتھ ان گنت غیر مطبوعہ خطوط، نایاب تصویروں اور خاکوں، منفرد مضامین نظم و نثر اور غیر مطبوعہ کلام کے ساتھ دوبارہ شایع ہوئی ہے۔ اس مقبول کتاب کو مدیر افکار صہبا لکھنوی نے مرتب کیا ہے۔ ۵۲۰ صفحات پر مشتمل یہ جامع و مستند کتاب اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے جس میں اردو کے تمام مشہور اہل قلم شریک ہیں۔ اس کتاب کو مکتبۂ افکار کراچی نے شایع کیا ہے۔

(صہبا لکھنوی)

اردو کہانیوں کا مجموعہ تامل زبان میں

اردو کہانیوں کا مشتمل پہلا تامل مجموعہ اسی ماہ مدراس کے کتاب گھر "اردو نو ویم" شایع کر رہا ہے۔ اس مجموعہ میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، سہیل عظیم آبادی، عصمت چغتائی، سریندر ناتھ، عادل رشید، رام لعل، زکی انور، کرشن گوپال عابد، سلام مچھلی شہری، کرتار سنگھ دگل، اختر عادل روپ، وغیرہ کی کہانیاں شامل ہیں۔ اور ان کہانیوں کو تامل ناڈ کے مقبول فنکار محمد رفیع نے ترجمہ کیا ہے۔ اسی مجموعہ کے ساتھ خواجہ احمد عباس کی کہانیوں کا ساتواں تامل مجموعہ "ابھی انسان زندہ ہے" بھی شایع ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے تامل زبان میں خواجہ احمد عباس کی کہانیوں کے چھ مجموعے اور عادل رشید کی کہانیوں کا ایک مجموعہ شایع ہو چکے ہیں۔

اردو تصنیفات کے ازبک ترجمے

نئی دہلی۔ ازبکستان کے ایک نوجوان ادیب نبی محمد دوانے علی سردار جعفری اور فیض احمد فیض کی نظموں کے جو ترجمے ازبک زبان میں کئے ہیں وہ تاشقند میں شایع ہو گئے ہیں۔ (ریاست)

شعری مجموعہ کالے کاغذ کی نظمیں شایع ہوگیا۔

باقر مہدی کا نیا شعری مجموعہ "کالے کاغذ کی نظمیں" شایع ہو گیا ہے اس میں منتخب نظموں اور غزلوں کے ساتھ "ایلیٹ اندرے وزنسنسکی" کے ترجمے بھی شامل ہیں قیمت چار روپے پچاس پیسے۔ یہ گوشۂ ادب ۲۱۔ اکیڈیا بلڈنگ بمبئی ۵ اور مکتبہ جامعہ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳ سے حاصل کی جا سکتی ہے

(شاہد علی خاں)

ادارہ شب خون سے نئی شاعری کے انتخاب "نئے نام" کی اشاعت

الہ آباد۔ ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ ادارہ شب خون ۱۹۶۰ کے بعد ابھرنے والے شعری رجحانات کا ایک نمائندہ انتخاب شایع کر رہا ہے۔ اس انتخاب میں ان تمام اہم شاعروں کو کلام شامل ہوگا جو ۱۹۶۰ کے بعد نمایاں ہوئے ہیں۔ ۱۲۸ صفحات کا یہ انتخاب ڈبل ڈیمائی سائز پر سہ رنگے گرد پوش کے ساتھ یکم ستمبر ۶۷ کو منظر عام پر آ رہا ہے۔ اس انتخاب کی قیمت ۳ روپے ہے اور یہ شب خون کتاب گھر ۳۱۳ رانی منڈی سے حاصل کی جا سکتا ہے۔

چاند میرٹھی

آئینہ حقیقت

(گذشتہ سے پیوستہ)

نیّر صاحب کو منشی پریم چند اور منشی پیارے لال شاکر میرٹھی کے رفیق دبستان ہونے پر کافی شک و شبہ تھا شاید وہ اس اقتباس سے دور ہو گیا ہو گا۔

نیّر صاحب بڑے حق گو آدمی ہیں۔ چنانچہ اپنے خط محررہ ۲۵ مئی ۷۵ء میں (مطبوعہ اردو ادب ۷۶ء) دعویٰ کیا تھا "...میں نے زندگی کے ایڈیٹر مقبول زلائل صاحب کے نام کئی خطوط لکھے۔ دو خطوط نا شد نون NOT KNOWN ہو کر واپس آ گئے۔ باقی کا علم نہیں..."

اب نیّر صاحب کی حق گوئی کا آئینہ ملاحظہ فرمائیے مقبول زلائل صاحب اپنے جریدہ زندگی کے ستمبر ۷۶ء میں اداریہ کے طور پر یہ ظاہر فرماتے ہیں: "...انجہانی حضرت پیارے لال شاکر میرٹھی مرحوم کے اوپر انتہائی ذلیل قسم کا حملہ کر کے ایک کینہ پرور نے ریسرچ کا کام کیا ہے ہم اس شخص کے متعلق بہت کچھ لکھ سکتے ہیں مگر صرف اس پر اکتفا کرتے ہیں کہ وہ شخص دروغ گو ہے۔ جو کچھ اس نے ہمارے بارے میں لکھا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ ہم نے خود اس کو زندگی کا شاکر نمبر بیناکاری کا پتہ اور شاکر مرحوم کا فوٹو بلاک اس کے زندگی دوست مسٹر نارنگ آف پی این ٹی کے ذریعہ بھیجا تھا جو اس کو مل بھی گیا تھا جس کا تذکرہ اس نے (نیّر صاحب نے) اپنے ایک خط میں کیا ہے۔ اگر اس میں ہمت تھی تو وہ شاکر کے جیتے جی ان پر حملہ کرتا۔ مرنے کے بعد تو بادشاہ کو بھی گالیاں دی جا سکتی ہیں...."

نیّر صاحب کی حق گوئی کی ایک ادنیٰ سی مثال آپ نے ملاحظہ فرمائی اب دوسری مثال اور ملاحظہ فرمائیے۔ اپنے ایک خط[1] میں (محررہ ۲۰ مئی ۷۶۵) میں آپ نے تحریر فرمایا "....اس لیے میں نے (نیّر صاحب نے) انھیں (نیّر کے ایک عزیز) پیارے لال شاکر میرٹھی پر کام کرنے کو کہا ہے۔ وہ آمادہ ہو گئے تو ہمیں فکر ہوئی کہ شاکر مرحوم کے بارے میں اردو میں بہت کم لکھا گیا ہے (یہ بھی نیّر صاحب کی حق گوئی ہے) اور ماہنامہ زندگی کے شاکر نمبر سے معلوم ہوا کہ ان کا بہت سا کلام ایسا ہے کہ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ اسی طرح ان کے خاندانی حالات (سوانح) بھی بہت کچھ پردۂ خفا میں ہیں۔ شاکر جیسے ادیب بے مثال اور شاعر یکتا کا نام (نیّر صاحب بھی شاکر صاحب کو شاعر یکتا تسلیم کرتے ہیں) اس طرح گمنام ہو جائے گا۔ اگر ان کے عزیز و اقربا اور احباب اس سلسلے میں طالب علموں کی مدد نہ کریں گے تو کون کرے گا...."

اب آپ ان کی اس تحریر کو پڑھیے اور پھر ان کے ان مضامین کو پڑھیے جو وہ شاکر مرحوم کے سلسلے میں لکھ رہے ہیں تو ان کی حق گوئی کا نقش آپ کے دل پر قائم ہو جائے گا۔ یہ بھی لکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کیونکہ نیّر صاحب حقیقت آئینہ میں (ص ۴ پر)[1] لکھ چکے ہیں کہ چاند صاحب کے بیان کی سب باتیں سو فیصدی غلط بیانی پر مبنی ہیں، پریم چند شاکر صاحب کے کبھی ہمسائے نہ تھے....

بہر حال دروغ گوئی سے کون کام لے رہا ہے اس کا فیصلہ قارئین کرام خود ہی کر لیں۔

نیّر صاحب نے میری ناقص تحریر کے بارے میں اپنی فاضلانہ رائے عنایت فرما دی اور یہ بھی اظہار فرما دیا ہے کہ اکسیر سخن کی شان نزول کے بارے میں میری کیا رائے ہے۔ کاش نیّر صاحب اکسیر سخن کے بارے میں میرے علاوہ دیگر اصحاب کی سند بھی ملاحظہ فرما لیتے۔ اوروں کو چھوڑیے خود منشی پریم چند دیباچۂ اکسیر سخن (ص ۱۹)[2] میں لکھتے ہیں "....حضرت شاکر نے یہ ترجمہ کر کے اردو زبان پر ایسا احسان کیا ہے جس سے وہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ ایک افسوسناک کمی جو اردو شعراء اور سخن سنجوں کے لیے باعث ندامت تھی حضرت شاکر کی کاوشوں کی بدولت ایک حد تک پوری ہو گئی۔ ان کے شاعرانہ انہماک نے اردو پبلک کو کالیداس کے لطیف جذبات اور خیالات سے حظ اٹھانے کا موقع دیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس رنگ میں انھیں پیشرو کا فخر حاصل ہے نومبر ۱۹۰۶ء میں کالیداس پر ایک مضمون رسالہ مخزن میں ان کے قلم سے نکلا تھا.... (ص ۱۸) اس تقصیر کی شکایت مسلمان ادیبوں سے نہیں مگر ہندو حضرات کے لیے بڑی ندامت کی بات ہے۔ کتنے ہی ہندو اصحاب ہیں جنھیں فن شعر سے ذوق ہے جو غزلیں اور قصیدے لکھتے ہیں اور گل و بلبل کے قصیوں میں سر کھپاتے ہیں مگر اتنی توفیق یا جرأت نہیں ہوئی کہ سنسکرت شعراء کے کلام سے قوم اور زبان کو فیض پہنچائیں اردو شعر و سخن کا چرچا زیادہ تر کایستھوں اور کشمیریوں میں ہے اور یہ دونوں فرقے اب تک عموماً سنسکرت کے مطالعے سے محترز ہیں:

سرور مرحوم کے رنگ کلام کو دیکھتے ہوئے کوئی بھی صاحب نظر یہ کہہ سکتا ہے کہ رتو سنگار میں سرور کے رنگ کلام کا شائبہ تک نہیں سرور کی غزلیات، نظمیں، قطعات ان سب میں الفاظ کی تراکیب لفظوں کی نشست طرز ادا۔ رنگ سخن قطعی جداگانہ ہے۔ اگر سرور کے بقیہ کلام کو سرور کا کلام تسلیم کیا جا سکتا ہے تو پھر اکسیر سخن ہرگز ہرگز ان کا کلام نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اکسیر سخن سرور مرحوم کے رشحات قلم تسلیم کیے جائیں تو پھر ان کا بقیہ کلام جو قطعی مختلف رنگ میں ہے کس شاعر کا ہے۔ غالباً نیّر صاحب کی دیدہ بینا میں تو.... کچھ نہیں ہے لہٰذا وہ ہی فیصلہ کریں۔

---

[1] نیّر کا خط بنام چاند محررہ ۲۰ مئی ۷۶۵

[1] حقیقت آئینہ ہماری زبان ص ۴

[2] دیباچۂ اکسیر سخن منشی پریم چند ص ۱۹-۲ ص ۱۵

برعکس اس کے جیسے میں پیشتر عرض کیا جا چکا ہے منشی پیارے لال شاکر میرٹھی کی پچپن سالہ شاعری کا رنگ کلام۔ طرز ادا، نشست الفاظ وغیرہ ان کے تمام کلام میں ایک ہے خواہ وہ قطعات تاریخ ہوں۔ منظوم تراجم ہوں یا شاعرے کی طرحی غزلیں۔ شاکر صاحب کے اقتباس کو نیر صاحب اس غرض سے پیش کر رہے تھے [illegible] کہ اس سے ان کے دعووں کی تائید ہو سکے مگر پہلے ہی اقتباس میں جو شاکر صاحب نے صریحاً لکھا ہے "...... چنانچہ میں نے ...... منگائے۔ جب رتوسنگھار کا نثر ترجمہ ہو چکا ہو اس کو نظم کرنے کی فکر ہوئی۔ خریف کا موسم قریب تھا لہذا سب سے پہلی نظم یہی لکھی گئی ...... لہذا میں نے درخواست کی کہ آپ ان نظموں کو دیکھ لیا کریں ......" اس پورے اقتباس میں انتہائی صفائی سے شاکر صاحب نے اپنے مصنف ہونے کا اقرار کیا ہے۔

اکسیر سخن میں جملہ سات نظمیں ہیں اور یہ نظمیں سنسکرت یا سنسکرت کے انگریزی ترجمے سے اردو نظم کے قالب میں حضرت شاکر مرحوم نے ڈھالی ہیں یقیناً اس مشکل اور دقیق کام میں کئی برس صرف ہوئے ہوں گے۔ ان نظموں میں سے کچھ یعنی شرد (خریف) دسمبر ۱۹۰۹ء میں ہیمنت (آغاز موسم سرما) جنوری ۱۹۱۰ء میں اور برکھارت جولائی ۱۹۱۰ء میں زمانہ کانپور میں شایع ہو چکی ہیں (اور انھیں شماروں میں سرور مرحوم کی حسرت دیدار اور مار آستین نظمیں بھی سرور کے نام سے شایع ہو چکی ہیں) لیکن اکسیر سخن کا نسخہ مجموعی طور پر ۱۹۱۲ء ہی میں مکمل ہوا تھا اور اسی برس شایع بھی ہو گیا۔

اس سے شاکر صاحب کی اس شاہکار تصنیف کی جزوی حصہ کی "تاریخ تصنیف" کی نشاندہی ہو جاتی ہے مگر اکسیر سخن کا باقی حصہ یعنی باقی کی ۴ نظمیں ۱۹۱۲ء تک لکھی گئیں اور ۱۹۱۲ء میں مکمل ہو جانے پر اسی سال کتابی صورت میں آ گئیں۔

۱۹۱۲ء کے دیوار گیر کلنڈر کے ورقوں کی الٹی طرف کچھ نظموں کے ابتدائی خاکے ہونے سے بھی اس خیال کو اور تقویت ملتی ہے۔ نیر صاحب محض اس بنا پر کہ ۱۹۰۹ء میں اکسیر سخن کی ایک نظم شاکر صاحب کے نام سے شایع ہوئی ہے یہ طے کرنے کو تیار ہیں کہ اکسیر سخن ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۰ء ہی میں تصنیف ہوئی جبکہ طول طویل چار نظمیں ۱۹۱۲ء تک مکمل ہوئی تھیں۔

نیر صاحب جس طریقے سے سرور مرحوم کا نام نامی اکسیر سخن سے جوڑ رہے ہیں وہ قابل غور ہے۔ اور جو شخص حقیقت حال بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے اس پر وہ یہ الزام تراشتے ہیں کہ شاکر صاحب کی طرفداری کی گئی ہے۔

حضرت جگر بریلوی اور منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی

کے ذاتی تعلقات ناخوشگوار ہو چکے تھے۔ لیکن ان حقائق و واقعات کو اس وقت تک بیان کرنا ضروری نہیں ہے جب تک کہ پانی سر سے نہ گذرنے لگے۔ شاکر صاحب کے ایک معاشقے کے سلسلے میں بھی جو رقابتیں ہوئی تھیں اور ان کا خمیازہ غریب شاکر صاحب کو اپنی ادبی زندگی میں جس بری طرح بھگتنا پڑا تھا وہ بھی کچھ لوگوں کے حافظے میں محفوظ ہے۔ مگر ان باتوں سے بچ کر اور ہٹ کر جب یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اکسیر سخن کے اصل مصنف شاکر مرحوم ہی تھے تو پھر ان باتوں کو درمیان میں لانا نامناسب سا معلوم ہوتا ہے۔

ہوا یہ ہے کہ شاکر صاحب کے افلاس نے انھیں اپنی زندگی کی سب سے پیاری پونجی یعنی اپنی تصانیف شعر و نثر کو بھی کوڑیوں کے مول بیچنے پر مجبور کر دیا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کی کچھ تصانیف نظم و نثر دوسروں کے نام سے بھی شایع ہو گئی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بھارت یا پاکستان میں ایسے شعراء موجود ہوں جو محض کلام شاکر کی بدولت اردو ادب کے چوٹی کے شاعر بننے کا فخر حاصل کر چکے ہیں۔ بہرحال شاکر صاحب کے قلم سے جو لازوال خزانہ نکلا ہے خواہ اس کا کتنا ہی حصہ خوشہ چینوں کے کام آ جائے جو کچھ تھوڑا بہت ان کے اپنے نام نامی سے شایع ہو گیا ہے وہی ان کا نام ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے بہت کافی ہے۔

نیر صاحب کے رنگ سخن اور مذاق شعر کے بارے میں تو سردست کوئی رائے پیش نہیں کر سکتا لیکن یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ اگر تھوڑی سی بھی توجہ سے کام لیا جائے تو سرور مرحوم اور شاکر مرحوم دونوں بزرگوں کے رنگ کلام میں امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ شاکر صاحب کا تمام کلام ان کے اپنے رنگ میں ہے جب کہ سرور مرحوم کا کلام ان کے مخصوص رنگ میں۔ شاکر مرحوم نے جس مستند رنگ میں اکسیر سخن کو پیش کیا ہے اسی رنگ میں ان کا بقیہ کلام بھی ہے۔ انھوں نے اپنے دور حیات میں جن مشاعروں میں شرکت کی (بالخصوص دہلی، بمبئی، اور لکھنؤ کے مشاعروں میں) اور جن میں اپنا طرحی و غیر طرحی کلام پیش کیا۔ انھوں نے مختلف اصناف سخن میں جو جولانیاں دکھائیں حتیٰ کہ فن تاریخ گوئی میں بھی جس طرز ادا سے وابستگی قائم رکھی وہ ان کا اپنا منفرد، مستند اور استادانہ رنگ ہے۔ اس قادر الکلام شاعر کا تمام کلام ایک ہی مخصوص رنگ میں ہے۔

نیر صاحب فرماتے ہیں کہ شاکر صاحب اور میرے بیانات میں تضاد ہے اور اس تضاد کی لے دے کے ایک مثال وہ اکسیر سخن کی تاریخ اشاعت میں اختلاف بتاتے ہیں۔ لیکن میں نے ان کے اس نقطۂ نگاہ کے بارے میں تشریح پیش کر دی۔

۱۔ اکسیر سخن مصنفہ جناب پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی مرحوم

خواجہ سائل حیدری دھنیائی گوالیاری کی تحریر سے نیر صاحب نے
[illegible]

غزلیں

فضل احمد کریم فضلی

نہ رہتے رنج و غم میں بھی خوش و خرم تو کیا کرتے
زمانے بھر کو ہم اپنا شریکِ غم، تو کیا کرتے
بلائیں بن بلائے مہماں کی طرح آپہنچیں
بلاؤں کا نہ کرتے خیر مقدم ہم تو کیا کرتے
حوادث پھر حوادث ہیں، ابھی آئے ابھی گذرے
سرِ تسلیم ان کے سامنے ہم خم تو کیا کرتے
کرم کرتے تبسم زیرِ لب بھی گر نہ فرماتے
ہمارے حال پر احباب آنکھیں نم تو کیا کرتے
توقع جن سے تھی وہ تو چراتے ہی رہے آنکھیں
دکھا لیتے نہ ہم زخموں پہ خود مرہم تو کیا کرتے
ہمارا اب یہ عالم ہے کہ تم بھی ہم پہ ہنستے ہو
تمہارا بھی یہی ہوتا اگر عالم تو کیا کرتے
بڑی مجبوریاں تھیں، زندگی سے کوئی سمجھوتہ
نہ کرتے تم تو کیا کرتے، نہ کرتے ہم تو کیا کرتے
تغافل سے، تجاہل سے، تبسم سے، تکلم سے
بڑھا دیتے ہو تم تو اور بھی غم، کم تو کیا کرتے
یہی تھا اک طریقہ مہرباں ان کو بنانے کا
نہ کرتے ہم انھیں کچھ اور بھی برہم تو کیا کرتے
ہمارے حوصلے کی، کوششیں کیں اور خود ہم کی
خدا نے مشکلیں آسان کر دیں ہم تو کیا کرتے
جسے دیکھا وہی تھا مست اپنے حال میں فضلی
نہ کر لیتے ہم اپنے حال پر ماتم تو کیا کرتے

آزاد گلاٹی

گھُل گھُل کر جیتے رہنے کو ریت کی ریت سمجھتی ہے
یہ وہ ہار ہے جس کو دنیا اک جیت سمجھتی ہے
وہ میرے گیتوں کی دنیا میری دھرتی کے آنگن میں
لہراتی، بل کھاتی جب کا بھی سنگیت سمجھتی ہے
وہ بادل جو امڑ گھمڑ کر بن برسے اڑ جاتا ہے
پیاسی دھرتی اس کو بھی اکثر اپنا میت سمجھتی ہے
اس در در دہ ہار کو آخر خود محسوس کرے گی تو
مجھ کو ٹھکرا کر جس کو اب اپنی جیت سمجھتی ہے
وہ ظلم کی مضراب سے ٹوٹے تاروں کی انجرا ہے
دنیا جس کو میرا اک پرکیف سا گیت سمجھتی ہے

سوویت یونین میں اردو ادب کی مقبولیت

گذشتہ چند دہوں میں مشرقی زبانوں کے سوویت مترجموں نے قارئین کو اردو ادب کی ممتاز ترین تخلیقات سے روشناس کرایا۔ میر امّن، مرزا غالب، پریم چند، ڈاکٹر اقبال، کرشن چندر، فیض احمد فیض، خواجہ احمد عباس اور دیگر فنکاروں کی تخلیقات روسی زبان میں ترجمہ کی گئیں اور سوویت یونین میں وہ بے حد مقبول ہوئیں۔

اردو کے بعض مصنفین کی تخلیقات کے تجزیہ سے متعلق روسی ادیبوں کی لکھی ہوئی کئی دلچسپ کتابیں اور مضامین شایع ہوئے ہیں۔ ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر نکولائی گلیبوف و الیکسی سوخوچیف کی نئی کتاب "اردو ادب" ہے۔ سوویت علوم شرقیہ کی تاریخ میں پہلی بار کتاب کے مصنفوں نے اردو ادب کی تاریخ ابتدا سے موجودہ زمانہ تک پیش کی ہے۔ اس کتاب کے ضمیمہ کے طور پر اردو ادب کے روسی تراجم کی فہرست اور اردو کے ادیبوں کی تخلیقات پر سوویت ادبی نقادوں کی کتابوں اور مضامین کی فہرست بھی دی گئی ہے۔

این گلیبوف اور اے سوخوچیف نے مغربی ممالک کے بہت سے مستشرقین کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کی اردو کی کلاسیکی شاعری ہندوستان کی حقیقت سے جدا رہ کر پروان چڑھی ہے اور اس شاعری میں فارسی ادب کے فنی ذرائع اور موضوعات کا تتبع کیا گیا ہے۔ مصنفین کی رائے میں دلی اور رنگ آبادی، نظیر اکبر آبادی، اور اس عہد کے دیگر نامور شعراء کی شاعری کے تجزیہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے ماحول سے ہی کئی موضوعات اور محاکات لیے، لوگوں کی نبض زندگی کو محسوس کیا اور ہندوستان کے عوام کی لوک کتھاؤں کا وسیع پیمانہ پر استعمال کیا۔

کتاب کے مصنف نے اردو کے کلاسیکی ورثہ اور ادبی روایات کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے جدید ادب کے بنیادی رجحانات کے ارتقاء کے مسائل پر خاص توجہ دی ہے، ممتاز ترین مصنفوں کی تخلیقات کے تجزیہ کو ان کی کتابوں کے اقتباسات کے ذریعہ مثالیں دے کر پیش کیا گیا ہے۔

این گلیبوف اور اے سوخوچیف نے جدید نثر نگاروں اور شاعروں مثلاً کرشن چندر، فیض احمد فیض، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، علی سردار جعفری، احتشام حسین، قرۃ العین حیدر، شوکت صدیقی، خدیجہ مستور، اور دیگر فنکاروں کی تخلیقات پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ مصنفین کی رائے میں یہ ادیب اب بھی نئے طریقے تلاش کرتے ہیں ایک نیا ہیرو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو نہ صرف پرانے نظاموں پر نکتہ چینی کرتا ہے بلکہ ایک آزاد و خود مختار ملک میں ایک نئی زندگی کی تعمیر میں حصہ بھی لیتا ہے۔ (حیات)

تحریر: ڈاکٹر نثار احمد
ترجمہ: اصغر عباس

زبان کے مسئلہ کا امکانی حل ۔ سہ لسانی فارمولا

کیسی بدقسمتی ہے کہ جب نہایت پیچیدہ اور مشکل لسانی مسئلہ کے حل کے سلسلے میں گرماگرمی ختم ہو رہی تھی اور مفاہمت کی ایک صورت پیدا ہو رہی تھی تو عین اسی وقت ایجوکیشن کمیشن نے جس کی صدارت کوٹھاری صاحب نے کی پھر اس بحث کے دروازے کھول دیئے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین جو اس کمیشن کے ممبر ہیں اور مسٹر چھاگلا جو اس کمیشن کے محرک ہیں کمیشن نے اس سمجھوتے کو بھلا دیا۔ جو برسوں کی گفت و شنید کے بعد مرکز اور ریاستی وزرائے اعلیٰ کے درمیان ہوا تھا۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کمیشن نے سمجھوتے کی نزاکت اور مسئلہ کی نوعیت کو پوری طرح نہیں سمجھا اور نہ ہی ان خطرات پر دھیان دیا جو اس مسئلہ کے دوبارہ اٹھانے سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کے معاملات میں فہم و فراست کا تقاضا تو یہ ہے کہ عوامی رائے کو تقویت دی جائے نہ کہ ایک مکمل فارمولے کی تلاش میں سرگرمی دکھائی جائے۔ کیونکہ ایسا کوئی فارمولا موجود ہے اور نہ آئندہ بنایا جا سکتا ہے جو کسی نہ کسی گوشے سے تنقید کا ہدف نہ بن سکے۔

لہٰذا عملی صورت یہی ہے کہ کسی ایسے حل کو مان لیا جائے جس پر تمام پارٹیوں کو اتفاق ہو اور اس کو اتنا موقع ملنا چاہیے کہ یہ عام طور سے قبول کر لیا جائے۔

جہاں تک سہ لسانی فارمولا کا سوال ہے تو اس کو ہندوستان کے لسانی مسئلہ کو پیش نظر رکھ کر ہی سمجھا جا سکتا ہے اس سلسلہ میں ہمیں دوسرے ممالک سے کوئی مثال نہیں مل سکتی۔ مثلاً روس، امریکہ، سوئٹزرلینڈ اور مختلف زبانوں کے ممالک برما، فلپائن، نائیجیریا وغیرہ جن میں روس میں روسی زبان پچپن فیصد آبادی بولتی ہے۔ امریکہ میں حالانکہ مختلف لسانی گروپ موجود ہیں لیکن انگریزی ہی قومی زبان ہے سوئٹزرلینڈ میں تین زبانیں بولی جاتی ہیں اور جو یکساں ترقی یافتہ ہیں چنانچہ تینوں سرکاری زبانیں ہیں۔ سوئس لوگ زیادہ تعلیم یافتہ ہیں اور وہاں تقریباً ہر آدمی دو زبانیں ضرور جانتا ہے برما کے ۶۲٪ لوگ برمی بولتے ہیں باقی ایک سو مختلف بولیاں بولتے ہیں فلپائن میں بھی ستاسی بولیاں ہیں اس لیے کاروبار کی زبان وہاں انگریزی ہے البتہ ادھر ملائی زبان کی ترقی کی طرف توجہ دی جا رہی ہے۔ نائیجیریا میں چار سو زبانیں ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی اعلیٰ تعلیم کے مقاصد کو پورا نہیں کر سکتیں۔ ہندوستان کی پندرہ زبانیں ہیں جو دستور ہند کے آٹھویں شیڈول میں درج ہیں ترقی یافتہ زبانیں ہیں جن کے پاس اپنا خاصا ادبی سرمایہ اور صدیوں کی روایات ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ان میں سے کسی کے پاس بھی سائنسی علوم و فنون کا وافر سرمایہ نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ یہ زبانیں فی الحال اعلیٰ تعلیم کی ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ اگر ضروری سہولتیں بہم پہونچائی گئیں تو ہر ایک اپنی جگہ پر اعلیٰ سائنسی تعلیم کا ذریعہ بن سکتی ہیں اس لیے فطری طور پر ان زبانوں کے بولنے والوں کو اپنے ثقافتی ورثہ پر فخر ہے اور وہ اس کی ترقی و ترویج کے خواہش مند ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ سیاسی اتحاد قائم رکھنے کے لیے یہ انتہائی ضروری سمجھا جاتا ہے کہ رابطے کے لیے ایک ایسی زبان رائج ہو جو ملک کے لیے لنگوا فرینکا ہو۔ جنگ آزادی کے دوران کانگریس نے ہندی کو اس مقصد کے لیے منتخب کیا تھا اور دستور کے مرتب کرنے والوں نے اس فیصلہ کی توثیق بھی کی تھی اور اسے قانونی شکل دی گئی لیکن اس فیصلے کے نفاذ میں کچھ واقعی مشکلات ایسی پیدا ہوئیں جن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سہ لسانی فارمولا اختیار کیا گیا۔ اس سلسلہ میں جو سوالات اٹھتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ کس منزل سے زبان کی تعلیم شروع کی جائے۔
۲۔ بیک وقت کتنی زبانیں پڑھائی جائیں اور کن درجوں تک۔
۳۔ کتنا وقت ان کے پڑھانے میں دیا جائے۔

اس بات سے سب متفق ہیں کہ مادری زبان کی تعلیم ابتدائی درجوں سے ہی شروع کرنا چاہیئے۔ جہاں مادری زبان علاقائی زبان سے مختلف ہو اور ان زبانوں میں سے ہو جو دستور کے آٹھویں شیڈول میں درج ہیں تو اس کی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے۔ بشرطیکہ پڑھنے والے دس ایک درجہ میں اور چالیس ایک اسکول میں (کافی ہوں)۔

یہ بھی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ مادری زبان ابتدائی اور ثانوی درجات ہی میں نہیں بلکہ بالآخر یونیورسٹی کی تعلیم میں بھی ذریعہ تعلیم ہونی چاہیے۔ جہاں تک دوسری زبان کا سوال ہے ایجوکیشن کمیشن کی یہ رائے ہے کہ یہ نچلے پرائمری درجات میں نہیں بلکہ اونچے پرائمری درجات سے شروع ہوگی وہ پانچویں درجہ یا گیارہ سال کی عمر سے شروع ہو اور تیسری زبان کی تعلیم نچلے ثانوی درجات یعنی آٹھویں درجہ یا چودہ سال کی عمر سے شروع ہو۔ ان تین زبانوں کی تعلیم نچلے ثانوی درجات میں ضروری ہو اور اس کے بعد اونچے سکنڈری درجات میں یعنی دس سے بارہویں درجہ تک صرف دو زبانیں پڑھائی جائیں۔

میری رائے میں ان سفارشات میں کمیشن نے زبانوں کی تعلیم سے متعلق موجودہ تعلیمی رجحانات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس مسئلہ پر دوسری جنگ عظیم کے بعد کافی غور و خوض کیا گیا ہے خصوصاً امریکہ میں جہاں ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹر میگراتھ جو مشہور ماہر تعلیم بھی تھا اس نے سب سے پہلے ابتدائی تعلیم میں غیر ملکی زبانوں کی تعلیم پر زور دیا اور اس نے اس حقیقت کو واضح کیا کہ چھوٹے بچے غیر زبانیں آسانی سے اور

جلد یہ تلفظ کے ساتھ بہ نسبت بڑے بچوں کے سیکھ لیتے ہیں امریکہ کی جدید زبانوں کی انجمن اور دوسرے تعلیمی اداروں نے بھی اس مسئلہ کو اٹھایا۔ چنانچہ ۱۹۵۳ء میں یونیسکو ایک کمیٹی دیسی زبانوں کی تعلیم میں اہمیت کے سلسلہ میں بنائی اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں اس بات پر زور دیا کہ پہلے اور دوسرے سال ہی میں بچے کو مادری زبان کے ساتھ ساتھ غیر ملکی زبانوں سے متعارف کرا دیا جائے۔

ماہرین نفسیات، لغویات اور عمرانیات نے بھی اس نئے رجحان کو تقویت دی۔ ماسکو یونیورسٹی کے پروفیسر جلیبو کے ذریعہ یہ حقیقت سامنے آئی کہ ہر ایک غیر ملکی زبان کی تعلیم اپنی جگہ پر متحرک عمل ہے اور اس سے بچے کے ذہن پر مادری زبان کی تعلیم حاصل کرنے میں کوئی غیر ضروری بوجھ نہیں پڑ سکتا۔

ڈاکٹر ولڈر پانفیلڈ کی رائے میں انسانی ذہن کی ساخت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ دس سے چودہ سال کی عمر تک زبانوں کو سیکھنے کی بہترین صلاحیت رکھتا ہے اس عمر کے بعد رفتہ رفتہ اس کے ذہن کی طاقت کم ہوتی جاتی ہے۔ اس رائے کی تائید اسٹیلے کاب ڈریک ڈیپی براؤن اور جان پی فلش وغیرہ نے کی ہے۔ ۱۹۵۷ء میں ڈاکٹر آرنلڈ گیسل اور ڈاکٹر فرانسس الگ نے بتایا کہ صحیح طریقہ کار سے بچہ جذباتی طور پر دوسری اور تیسری زبانیں بھی سیکھ سکتا ہے۔

ابتدائی درجوں میں غیر ملکی زبانیں سکھانے کی تحریک کے اثرات بہت شاندار رہے ہیں صرف ۱۹۵۳ء میں امریکہ میں ۴۵۶۰۰ بچے غیر ملکی زبانیں پڑھ رہے تھے ۱۹۵۹ء میں یہ تعداد ۱۲۷۰۰۰ ہوگئی اور ۱۹۶۲ء تک امریکہ کی اڑتالیس ریاستوں میں سے ہر ایک میں اور ضلع کولمبیا میں ابتدائی درجوں ہی سے یہ زبانیں سکھائی جا رہی تھیں۔

پرائمری درجات میں غیر ملکی زبانیں پڑھائے جانے کا سلسلہ اس بات کا واضح ثبوت فراہم کرتا ہے کہ پانچ سے دس سال تک کی عمر بچوں کے لیے غیر ملکی زبانیں پڑھنے بولنے اور سمجھنے کے لیے زیادہ معاون ہے چنانچہ برطانیہ میں بھی پرائمری درجات میں غیر ملکی زبانیں رائج کی جا رہی ہیں اور جیسے جیسے یہ حقیقت منکشف ہوتی جاتی ہے اس بات کو زیادہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ بچوں کی گفتگو میں بھی وہی صوتی آہنگ ہوتا ہے جو بڑی عمر کے کئی زبانیں جاننے والوں میں پایا جاتا ہے۔

بچوں کو کتنی زبانیں پڑھائی جائیں۔ یہ صرف تعلیمی سوال نہیں ہے کہ جیسا بعض لوگ سمجھتے ہیں گو تعلیمی نقطۂ نظر سے کہیں بھی اس بات اختلاف نہیں ہے کہ بچوں کو بیک وقت تین زبانیں نہ پڑھائی جائیں۔

مختلف مشاہدین کا بیان ہے کہ جب حالات متقاضی ہوتے ہیں تو بچے بیک وقت تین زبانیں قدرتی طور پر اور آسانی سے سیکھ جاتے ہیں ہندوستانی بچے جو اجنبی دیسوں میں رہتے ہیں وہ گھر میں اپنی مادری زبان ہی بولتے ہیں مگر اس ملک کے باشندوں میں ملاقات کے موقع پر اس ملک کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ اور انگریزی یا دوسری زبانیں سیکھتے ہیں۔ برطانیہ کے گرامر اسکولوں میں بچے تین زبانیں سیکھتے ہیں۔ انگریزی اور دو جدید غیر ملکی زبانیں یا ایک جدید اور ایک کلاسیکل۔ روس میں علاقائی، روسی اور جدید غیر ملکی زبانیں بہت سی ریاستوں میں عام ہیں۔

اس سلسلہ میں یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری ہے کہ تعلیم ایک بوجھ ہے تکلیف دہ اور خشک۔ حالانکہ بچے میں فطری طور پر سیکھنے کے رجحانات پائے جاتے ہیں اور نئے مضامین کا پڑھنا نہ صرف اس کی جبلت کو تسکین دیتا ہے بلکہ اس کے اندر طمانیت، خود اعتمادی اور مہارت کا احساس بھی پیدا کرتا ہے۔ ایک بچہ اسی وقت نئے مضامین سے گھبراہٹ اور بے چینی محسوس کرتا ہے جبکہ طریقہ تعلیم میں خامی ہو اور پڑھانے والے اہل نہ ہوں۔

۱۹۴۴ء میں امریکہ کے نیشنل کمیشن فار یونیسکو نے یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ زمانہ آئے گا جب مربی تعلیم یافتہ محسوس کریں گے کہ انھیں ایک عام زبان اور ایک غیر معروف بیرونی زبان سیکھنی چاہیے۔ زبانوں کی تعلیم کی مدت کا سوال بہت سے ملکوں میں توجہ کا مرکز بن چکا ہے اسکینڈے نیوین ملکوں میں زبان کی تعلیم کی مدت دس سال تک ہو سکتی ہے۔ مغربی جرمنی میں بھی غیر ملکی زبان سات برس تک پڑھائی جا سکتی ہے۔ نیو یارک کے ریاستی شعبۂ تعلیم میں اس کے لیے چھ سال کا نصاب رائج ہے۔ اور سمر ویل، فیر فیلڈ اور پرنسٹن میں دس سالہ کورس داخل ہے کلیولینڈ میں بارہ سالہ نصاب شامل کیا گیا ہے۔ یہ بات اب پورے طور پر تسلیم کی گئی ہے کہ دو یا تین سال کا کورس پورے طور پر زبان کی تعلیم کے لیے ناکافی ہے تو وہ پورے طور پر بے اثر یا بے نتیجہ نہ ہو۔

اس بحث سے کئی نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ ابتدائی درجات میں تین زبانوں کا پڑھانا بہتر ہے لیکن ہوشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ پرائمری درجات میں تین زبانوں کا پڑھانا لازمی ہو جانا چاہیے۔

۲۔ مدرسہ کی تعلیم کے زمانے میں ذریعہ تعلیم مادری زبان ہو اور رفتہ رفتہ یونیورسٹی کے معیار پر اس کی جگہ انگریزی زبان کو دینا چاہیے۔

۳۔ ہندی زبان غیر ہندی علاقوں میں دوسری ضروری زبان ہونا چاہیے اس کا سبب یہ ہے کہ ہندوستان میں ایک رابطے کی زبان ہو۔ جاتے ایسی زبان غیر ہندوستانی نہ ہونا چاہیے جیسے کہ انگریزی جو ہمارے ثقافتی ورثہ میں شامل تھی

میں جو کلیدی چیز کی حیثیت رکھتی ہے جس کا لسانی ڈھانچہ بھی ہندوستان کی کسی زبان سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ دوسری طرف تمام ہندوستانی زبانیں ایک ثقافتی بنیاد رکھتی ہیں اور وہ یہاں کے تاریخی اور سماجی پس منظر میں برابر کی حصہ دار ہیں اور ان میں سے زیادہ تر زبانیں ایسی ہیں جو زبان کے آرین خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کے بہت سے الفاظ کا مادہ اور مخرج ایک ہی ہے یہ زبانیں ہندوستان کے مشترک کلچر اور زندگی کے مشترکہ تجربے کو پیش کرتی ہیں اور یہی چیز ہندوستانی قومیت کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔

۴۔ جن علاقوں کی مادری زبان ہندی ہے وہاں جدید ہندوستانی زبانوں میں سے ایک زبان پڑھائی جانا چاہیے اس طرح ہندی بولنے والوں کو موقع ملے گا کہ وہ دوسرے علاقوں سے براہ راست اپنے رشتے کو استوار کریں۔

۵۔ تیسری لازمی زبان انگریزی ہو لیکن انگریزی صرف استفادی زبان ہے اور اس کا استعمال ہندی کے متبادل میڈیم کے طور پر علاقائی زبانوں کے ساتھ عارضی مدت تک جب تک ہندی تمام مرکز میں دفتری زبان کے طور پر قبول نہ کر لی جائے اس لیے انگریزی ان زبانوں میں سے ہے جو پرائمری درجات میں لازمی اور ثانوی درجوں میں اختیاری ہونا چاہیے۔

۶۔ سہ لسانی فارمولا ایجوکیشن کمیشن نے منظور کیا۔ سہ زبانوں کا فارمولا جیسے دوسروں نے تجویز کیا ہے حالات کے پیش نظر ہماری ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ کمیشن انگریزی کی جگہ ہندی کو لانا چاہتا ہے جبکہ طلبہ کی خاص تعداد ہندی سے واقف نہیں۔ مخصوص صلاحیتیں رکھنے والے طلبہ کے لیے تعلیمی نظام کو ایک مزید زبان کی تعلیم کا انتظام کرنا چاہیے۔

صفحہ ۴ سے آگے

شاکر صاحب کے مصائب کا حال پڑھ کر صرف یہ نتیجہ اخذ کیا کہ شاکر صاحب پر دیوانی کے مقدمات چلے۔ نیر صاحب اگر فراخدلی سے کام لیں اور غیر ممالک کے ادباء اور شعراء کے سوانح کو دیکھیں تو انھیں افلاس کے ہاتھوں کسی ادیب کی ایسی بربادیوں کی کئی داستانیں مل جائیں گی ضرورت انسان کی سب سے بڑی مجبوری ہوتی ہے اور پھر وہ ایک ایسا خونیں دور تھا جب انگریزی سامراجیت اپنی پوری طاقت دکھا رہی تھی ہم ہندوستانیوں کا گلا گھونٹے ہوئے تھی لہٰذا ان مقدمات کی موجودگی سے شاکر صاحب کی ادبی و شاعرانہ حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ابھی ابھی جب میں یہ سطور مکمل ہی کر رہا تھا مسٹر الف۔ ایم نجم الدین ایڈیٹر افوت لاہور کا ۸ر فروری کا خط[1] مجھے موصول ہوا۔ نجم الدین صاحب نے اپنے خط میں جناب شاکر میرٹھی کے لیے مجھے لکھا ہے"..... آپ کو ان کی دینی شاکر صاحب کی، ایک مسیحی غزل مکمل یاد ہو تو مجھے لکھ بھیجیں۔ مجھے اس کے صرف تین شعر یاد ہیں ؎

در علی سے کہیں اب نہیں جانا مجھ کو
اس سے اچھا نہیں ملے کا ٹھکانا مجھ کو
ذرا آنکھوں میں تو سینہ میں سرور آجائے
اے مسیح! اپنی ذرا شکل دکھانا مجھ کو
دیکھو عشق مسیحا میں تمہیں کہکے سلام
حشر تک سوتا ہوں بس اب جگانا مجھ کو

شاکر صاحب کا جتنا کلام میں نے اپنے مضمون آئینہ حقیقت میں پیش کیا ہے وہ مختلف اخبارات سے نقل کر کے پیش کیا ہے اور ان کے رشحات میرے پاس محفوظ ہیں میں ان کے نام بھی ظاہر کر چکا ہوں ان اشاعتوں کی تفصیل بھی پیش کر سکتا ہوں۔

---

[1] خط مورخہ ۸ر فروری ۹۰ء جناب ایم الف نجم الدین بنام راقم۔

مراسلات

ترسم کہ بکعبہ نرسی اے اعرابی
کیں راہ کہ تو می روی بترکستانست

فیض احمد صاحب فیضؔ سے میں اس وقت متعارف تھا جب وہ ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر (پنجاب) میں بحیثیت پروفیسر مامور تھے اور ان کا مسکن شریف پورا امرتسر کی ایک پرسکون عمارت تھی۔ میں الفتوں میں آوارہ طبیعت گروہ کا ایک ممتاز فرد تھا۔ میری ساری ملاقاتیں خوش گپیوں تک محدود تھیں۔ فیضؔ صاحب کی نوجوانی کا یہ دور اس شہرت سے بالکل بیگانہ تھا جو عرصہ مابعد میں فیضؔ صاحب کو مقدر رہی۔

مشاہیر ملک میں شمولیت کے بعد فیضؔ صاحب عروس البلاد بمبئی میں کئی ایک بار تشریف لائے لیکن میری کم مائیگی نے اتنی ہمت نہ دی کہ رسم کی تجدید کرتا۔ ملکی بٹوارے کے بعد تو فیضؔ صاحب مرجع خلائق بن کر بمبئی میں تشریف لائے مگر میرے لیے باعث کشش نہ ہوئے۔ امکان ہے کہ وہ مجھے صورت دیکھ کر پہچان سکیں ورنہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہو چکے ہیں۔

"ہماری زبان" مورخہ یکم جولائی ۱۹۶۶ء میں ایک مضمون بعنوان "ترقی زبان اردو میں ترویج تنزل" میں فیضؔ صاحب پر کیچڑ اچھالنے کی نامسعود کوشش نے رگِ احساس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ جس میں سے شوقؔ صاحب نے فیضؔ صاحب کے اس شعر پہ حرف رکھا ہے ؎

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

شوقؔ صاحب کو اعتراض ہے کہ کسی اہل سخن نے عروض کی غلط بیانی پر گرفت نہ کی۔ مضمون پر البتہ صرف میں نے جنوری ۱۹۶۶ء کے ماہنامہ عارف میں آنا عرض کر دیا تھا کہ گلوں کا کاروبار تو سمجھ میں آ سکتا ہے جن سے گلقند یا ہار بنائے جا سکتے ہیں۔ لیکن گلشن کا کاروبار میری سمجھ سے بالاتر ہے" مزید برآں شوقؔ صاحب (جن کا حسب نسب ابھی تک مجھ پر ہنوز نہیں کھلا) فرماتے ہیں:۔

"شعرا اہل علم و قلم اساتذہ کی اس بے توجہی سے ہی ایسے بے علم شعرا و ادبا نے فلمی اور ریڈیو کے سرپرستان اردو پر قابض ہونے کی جرأت کی ہے اور کر رہے ہیں۔ جو نہ صرف زبان اردو کے صحیح الفاظ کو غلط الفاظ میں اور ترقی اردو کو تنزل میں تبدیل کر دیتے ہیں بلکہ اپنے اور گذشتہ دور کے اساتذہ کے پاکیزہ اشعار کا سرقہ کر کے ناپاک و مضحکہ خیز بنانے کے صلہ میں ہزاروں روپے ان سرکاری اور غیر سرکاری اداروں سے بٹور رہے ہیں"

جہاں تک شوقؔ صاحب کی عروض کی غلط بیانی کا بے ساختہ اعتراض ہے میں شوقؔ پر واضح کر دوں کہ عروض کے اعتبار سے فیضؔ صاحب کے شعر کی تقطیع یوں ہے:۔

گلو　مرن　گ بھرے　با　دِ نو　بہا　ر چلے
مفاعلن　فعلاتن　مفاعلن　فعلن
چلے　بیا　ؤ کہ گل　شن　کہ کا　ر با　ر چلے
مفاعلن　فعلاتن　مفاعلن　فعلن

اس میں شوقؔ صاحب کو غلط بیانی کہاں دکھائی دیتی ہے وہ صرف اہل عروض بتا سکتے ہیں۔ گلوں کے کاروبار میں البتہ اپنی تربت کو نظر انداز کر گئے ؎

کیا چڑھاؤ گے مری تربت پہ پھول؟

میں "ہماری زبان" کے صفحات کو اکھاڑا بنانا نہیں چاہتا ورنہ فلمی اور ریڈیو کے "سرپرستان اردو" کا ایسا جملہ تحریر کرنے والے شوقؔ صاحب سے پوچھتا کہ آپ کے منہ میں کے دانت ہیں۔ میں شوقؔ صاحب کی غلط سلط عبارت اور فیضؔ صاحب ایسے شاعر کو "بے علم شعرا" کی زد میں لانے والے ان سطور پر معتوبیتی میں ایک مضمون بعنوان

تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائیست

تحریر کر رہا ہوں۔

(آغا خلش کاشمیری)

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

"ہندی کے ایک مشہور شاعر بھرتری ہری کے اس فلسفیانہ نظریہ پر کہ

جو شخص کسی شیطان صفت انسان کو بزرگوں کے پند و نصائح سے نیک بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی کوشش ایسی ہی ہے جیسے کہ کسی بدمست ہاتھی کو کسی دنٹھل کے ریشوں سے باندھنے کی یا نرم و نازک پتی سے ہیرے میں چھید کرنے کی۔ یا سمندر کے کھاری پانی کو امرت کی ایک بوند سے میٹھا کرنے کی کوشش کی جائے۔

بھرتری کے اس نظریہ میں حقیقت تو ہے مگر جدت اور ندرت نہیں۔ البتہ علامہ اقبالؔ نے اس میں جو جدت اور اس کی جو قوت افزائی کی ہے وہ مثبت ہو سکتی ہے نہ کہ استفہامیہ؟ اس میں کٹ سکتا ہے کا فقرہ خود مثبت ہونے کی دلیل ہے۔

مضمون اور ترجمہ دونوں صاف ہیں ؎

اگرچہ پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کٹ جانا ناممکن۔ ممکن ہو سکتا ہے جیسے کہ اسلام سے قبل عمر فاروقؓ جیسے جابر و قہار انسان کے پتھر جیسے دل پہ نرم و نازک فرمانِ ایزدی نے گھر کر لیا تھا لیکن اس مرد ناداں کے (جو ایمان سے تہی دامن ہو) ایسا نازک کلام (جو شرف انسانیت پر نہیں ہوا) اثر نہیں کرتا۔

میرے ناچیز خیال میں علامہ اقبالؔ کے شعر کا مفہوم یہی ہے اور یہی مفہوم آئندہ زمانہ سے وابستہ کیا بھی جا سکتا ہے۔

(شوقؔ۔ مدیر عارف لاہور)

پارلیمنٹ کی تعلیمی کمیٹی نے نئی لسانی پالیسی کی سفارش کی

نئی دہلی۔ واقف کار حلقوں کی اطلاع کے مطابق ممبران پارلیمنٹ کی ۔۔۔ رکنی تعلیمی کمیٹی نے ایک نیا فارمولہ مرتب کیا ہے جو تعلیمی میدان میں دور رس نتائج کا حامل ہوگا۔ بتایا گیا ہے کہ کمیٹی نے وزیر تعلیم ڈاکٹر ترگن سین کی صدارت میں ایک پلان تیار کیا ہے جسے مرکزی حکومت کی منظوری کے لیے بھیجا جائے گا۔

کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں سہ لسانی فارمولے کی بجائے دو لسانی فارمولے کی تجویز پیش کی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ تیسری زبان سیکھنے کی بھی ہمت افزائی کی جائے۔

کمیٹی نے دس سال اسکول کی تعلیم کے لیے صرف ایک زبان کی تعلیم لازمی قرار دی ہے اور یہ زبان علاقائی یا مادری زبان ہوگی۔

دوسرے مرحلے پر پرائمری کے بعد دسویں درجے تک اسکولوں میں آئین کی ۸ ویں شیڈول میں درج کسی زبان یا انگریزی کی تعلیم دی جائے گی۔ آٹھویں درجے کے بعد ایک تیسری زبان اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جا سکتی ہے بشرطیکہ طالب علم اس کے لیے آمادہ ہو۔

کمیٹی کی رائے میں علاقائی زبان، مادری زبان، ہندی، انگریزی یا کسی دوسری زبان کی تعلیم اسکول کے مرحلے تک ضروری ہے۔

ہائر سکنڈری کے مرحلے پر علاقائی زبان کے علاوہ صرف ایک مزید زبان کی تعلیم کو لازمی قرار دینے کی سفارش کی گئی ہے جب کہ یونیورسٹی اسٹیج پر کسی بھی زبان کی تعلیم لازمی نہیں قرار دی گئی ہے۔ یونیورسٹی اور کالج کے مرحلے پر تمام زبان کو اختیاری مضمون کی حیثیت دی گئی ہے۔

اس فارمولہ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندی ریاستوں میں انگریزی کی تعلیم اور غیر ہندی علاقوں میں ہندی کی تعلیم لازمی نہیں ہوگی لیکن اس کے ساتھ ساتھ دونوں زمروں کی ریاستوں کو ان طلبہ کے لیے جو ہندی یا انگریزی کی تعلیم حاصل کرنا چاہیں گے ان کے لیے ان زبانوں کی تعلیم کا انتظام کرنا ضروری ہوگا۔

مبصرین کا خیال ہے کہ اس نئے فارمولے کو اگر منظور کر لیا گیا تو ہندی انگریزی کا جھگڑا ختم ہو جائے گا۔

کمیٹی نے دوسری اہم سفارش یہ کی ہے کہ تمام مراحل پر علاقائی زبانوں کی تعلیم کا انتظام تمام اداروں کے لیے ضروری قرار دے دیا جائے۔ کمیٹی نے اس کے لیے ۵ سال کی مدت مقرر کی ہے۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں جنرل اردو کی تعلیم شروع

جنرل انگریزی کی لازمی حیثیت ختم کر دی گئی

لکھنؤ۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ حکومت اترپردیش نے لکھنؤ یونیورسٹی میں فیکلٹی آف آرٹس کے طالب علموں کے لیے جنرل انگلش کی لازمی حیثیت ختم کیے جانے کے فیصلے کی توثیق کر دی ہے۔ اب تک طلبہ کے لیے جنرل انگلش لازمی تھی لیکن اب اس کو اختیاری بنا دیا گیا اور طلبہ کو دوسری زبانیں پڑھنے کی اجازت بھی دی گئی ہے جن میں جنرل انگلش بھی شامل ہے۔

چنانچہ اسی سیشن میں لکھنؤ یونیورسٹی میں بی۔ اے کے درجات میں جنرل اردو کی تعلیم شروع ہو جائے گی۔ اب تک ان درجات میں صرف جنرل ہندی، جنرل سنسکرت اور جنرل تامل وغیرہ کی تعلیم ہوتی تھی۔

جنرل اردو وہ طلبہ بھی لے سکیں گے جن کی مادری زبان اردو ہے لیکن جنہوں نے ہائی اسکول یا انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں اردو کو بہ حیثیت مضمون نہیں پڑھا ان کے علاوہ وہ طلبہ بھی جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے جنرل اردو پڑھ سکیں گے۔

یہاں کے ادبی و لسانی حلقوں میں لکھنؤ یونیورسٹی کے اس فیصلے پر خوشی کا اظہار کیا جا رہا ہے اور حلقوں کا تاثر ہے کہ جہاں اس سے اردو کا دائرہ وسیع ہوگا وہیں یونیورسٹی کے طلبہ میں خوشگوار تہذیبی رشتے بھی استوار ہوں گے۔ (قائد)

مقامی شاخوں سے متعلق بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کا سرکلر

پٹنہ۔ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری جناب مولانا مہتاب صدیقی نے حسب ذیل اعلانیہ بابت مقامی انتخابات بغرض اشاعت بھیجا گیا ہے۔

شاخوں کے لیے مقامی انتخاب کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل ضوابط کی پابندی ضروری ہے۔

۱۔ کسی شاخ کے قیام یا اس کی تجدید کے لیے ۔۔ ممبروں کا ہونا ضروری ہے

۲۔ مقامی اور شاخوں کو اپنی مرضی کے مطابق مجلس عاملہ کے اراکین کی تعداد متعین کرنے کا حق ہوگا۔

۳۔ ضلع شاخوں کی کانسل ہوگی جب کہ مقامی شاخوں کی کانسل نہ ہوگی۔

۴۔ ضلع کے صدر مقام ضلع شاخ کے علاوہ حسب ضرورت مقامی شاخ بھی قائم کی جا سکتی ہے۔

۵۔ مقامی یا ضلعی شاخوں کے انتخاب کی نگرانی کے لیے صرف وہی ریٹرننگ آفسر یا ان کے معاون جائیں گے جہاں ان کو بھیجنا ریاستی انجمن ضروری سمجھے یا جہاں سے ریٹرننگ آفسر کی طلبی ہوگی۔ طلبی کی صورت میں آمد و رفت اور قیام و طعام کی ذمہ داری اس شاخ پر ہوگی۔

۶۔ مقامی اور ضلعی شاخوں کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ اپنے یہاں کی انتخاب کی تاریخ سے کم از کم ایک ہفتہ پہلے ریاستی انجمن کو مطلع کر دیں۔

۷۔ مقامی یا ضلعی شاخ کے انتخاب کے بعد انتخاب کے سلسلے میں دفتر ریاستی انجمن ترقی اردو کو کسی قسم کی کوئی شکایت موصول ہونے پر ریاستی انجمن مناسب کارروائی کرے گی۔

۸۔ عام طور پر ضلع کے صدر مقام میں ہی ضلع انجمن ترقی اردو کا صدر دفتر ہوگا۔

۹۔ ۳۱ر جولائی تک مقامی شاخوں کا انتخاب مکمل ہو جانا لازمی ہے۔

یوپی کی نئی حکومت کانگریسی سرکار کے مقابلہ میں اردو کی زیادہ حوصلہ افزائی کرے گی

لکھنؤ۔ اترپردیش قانون ساز اسمبلی نے دو روزہ مباحثہ اور کانگریس کی ایک تحریک تخفیف کو مسترد کرنے کے بعد محکمہ تعلیم کا ۳۴ کروڑ ۴۰ لاکھ روپیہ کا بجٹ آج پاس کر دیا۔

بحث کا جواب دیتے ہوئے نائب وزیر اعلیٰ رام پرکاش نے کہا کہ اپوزیشن کو اردو زبان کے بارے میں حکومت کی پالیسی پر اعتراض ہے لیکن میں اسے یقین دلا سکتا ہوں کہ نئی حکومت اردو کی زیادہ حوصلہ افزائی سابق حکومت کے مقابلے میں کرے گی جس نے عملی طور پر اردو کے لیے کچھ نہیں کیا۔

ضیاء الرحمٰن (کانگریس) نے کہا ہے کہ اردو کو مناسب طور پر تسلیم کرنے کی پالیسی جنتا پارٹی کے انیس نکاتی پروگرام میں شامل تھی لیکن وزیر تعلیم نے اپنی بجٹ تقریر میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا آج ریاستی قانون ساز کونسل میں بجٹ پر بحث کے دوران بعض ممبروں نے اردو کی وکالت کی۔

کانگریسی حکومت کے سابق پارلیمنٹری سکریٹری مولانا شاہد فاخری نے تعلیمی پالیسی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ حکومت نے واضح طور پر اس مطالبہ کو مسترد کر دیا کہ اردو کو ریاست کی دوسری زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔ اس سے ریاست کی اردو بولنے والی آبادی کے مذہب سے متعلق معاملات متاثر ہوتے ہیں۔

مولانا عبد الرؤف (کانگریس) نے اردو زبان کو مناسب مقام دینے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ حکومت دعویٰ تو یہ کرتی ہے کہ اس نے اس سلسلے میں بعض سہولتیں فراہم کی ہیں لیکن یہ سب کاغذ پر ہیں۔ عملی میدان میں اسے نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

کانگریس کے جناب نول کشور نے اپنی تقریر میں کہا کہ یہ صحیح ہے کہ کانگریس اپنے دور میں اردو کو اس کا جائز اور آئینی مقام نہیں دے سکی حالانکہ اس نے اس سلسلہ میں ضروری اقدامات تجویز کئے البتہ عمل درآمد کی کمی رہی جس کا نتیجہ بھی اسے بھگتنا پڑا لیکن کانگریس نے نہ تو اردو کے نام پر الکشن لڑا اور نہ اردو والوں سے وعدے کئے۔ سنیکت دھاگہ دل نے اردو والوں کے ووٹ حاصل کرکے اقتدار حاصل کیا۔ اور اب اسے اپنے وعدے پورے کرنے چاہئیں۔

نائب وزیر خوراک و رسد شمیم عالم خاں صاحب نے حزب مخالف کے اراکین کی نکتہ چینیوں کا جواب دیتے ہوئے اردو کی حق تلفی کے لیے کانگریسی دور حکومت کو ذمہ دار ٹھہرایا اور اس احساس کا اظہار کیا کہ اگر ہماری حکومت نے اردو زبان اور اقلیتوں کے مسائل کو نظر انداز کیا تو اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو کانگریس کا ہو چکا ہے۔ (ریاست)

عثمانیہ میٹرک کا امتحان اردو میں بھی منعقد ہوگا

حیدرآباد۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے ایک پریس نوٹ میں بتایا گیا ہے کہ جناب حبیب الرحمٰن کو وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے ایک ملاقات میں بتایا ہے کہ انجمن ترقی اردو کے مطالبہ کو تسلیم کرتے ہوئے عثمانیہ میٹرک کا امتحان اردو میں بھی منعقد کیا جائے گا یاد ہوگا کہ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے سالانہ اجتماع منعقدہ دسمبر ۱۹۷۶ء میں ایک قرارداد کے ذریعہ عثمانیہ یونیورسٹی سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ عثمانیہ میٹرک کا امتحان انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی منعقد کیا جائے چند دن پہلے جناب حبیب الرحمٰن نے ڈاکٹر ڈی ایس ریڈی سے ایک ملاقات میں اس بات پر زور دیا تھا کہ نئے تعلیمی سال کے آغاز سے پہلے ہی یونیورسٹی کو اپنے فیصلہ کا اعلان کر دینا چاہئے۔ اور یہ مطالبہ بھی کیا تھا کہ عثمانیہ میٹرک کا امتحان انگریزی کے علاوہ صرف اردو ہی میں نہیں بلکہ تلگو اور ہندی میں بھی منعقد ہونا چاہئے ڈاکٹر ڈی ایس ریڈی نے کل جناب حبیب الرحمٰن کو ایک ملاقات میں یونیورسٹی کے فیصلے سے مطلع کیا ہے کہ عثمانیہ میٹرک کا اگلا امتحان انگریزی کے علاوہ ہندی تلگو اور اردو میں بھی منعقد ہوگا۔

حکومت اترپردیش نے اردو والوں کو فریب دینے کے لیے ایک بے اثر اردو کمیٹی بنائی ہے

لکھنؤ۔ اردو جرنلسٹ ایسوسی ایشن کے سکریٹری جناب اقبال صدیقی نے آج ایک بیان کے ذریعہ یوپی کی کانگریسی سرکار کی جانب سے اردو کمیٹی کے قیام کو جو محض ڈائرکٹر تعلیمات اور چار ناظمین تعلیم پر مشتمل ہے ایک فریب بتایا ہے اور کہا ہے کہ یوپی کے نائب وزیر اعلیٰ جو وزیر تعلیم بھی ہیں انھوں نے ۲۶ مئی کو اردو صحافیوں سے جس صلاح کمیٹی کی تشکیل کا وعدہ کیا تھا وہ ہنوز تشنۂ تکمیل ہے۔ اس فرقی کمیٹی جس پر جون کی تاریخ دی ہے اور جو اس ہفتہ بجٹ میں شائع ہوا ہے معلوم ہوگا کہ اردو کی اس خدمت میں اردو کی تخریب پوشیدہ ہے اردو کے مسئلہ پر صوبائی پیمانہ پر عملی تحریک چلانے اور تمام حالات کا جائزہ لینے کے لیے یوپی کے اردو اخبار نویسوں کی ایک کانفرنس ہوگی اور اس سلسلہ میں ایک مشاورتی جلسہ اگلے ہفتہ ہوگا۔

تبصرے

شہریار

علامہ اقبال بھوپال میں۔ عبدالقوی دسنوی

قیمت:۔ ایک روپے پچیس پیسے

ملنے کا پتہ: شعبۂ اردو سیفیہ کالج بھوپال

رابندر ناتھ ٹیگور کے سلسلے میں، ابھی چند دن پہلے پاکستان میں جو ہنگامہ ہوا وہ نہایت افسوسناک ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ملک اس قسم کی ذہنیت سے پاک ہے، اگر اس قسم کا رجحان یہاں کبھی پیدا ہوا تو سب سے پہلے "اقبال" زد میں آئیں گے کیونکہ ہمارے "بعض ناقدین" اور "مفرضوں" نے ان کے سلسلے میں بار بار اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ وہ پاکستان کے بانی اور خالص اسلامی شاعر ہیں۔

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے

بہر حال ہندوستان اقبال کی شاعری سے کسی قیمت پر بھی دستبردار نہیں ہو سکتا اور یہاں ان کے کلام کی قدر و قیمت کبھی کم نہیں ہوگی اور ان کی شخصیت اور کارناموں کو سمجھنے اور پرکھنے کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔

عبدالقوی دسنوی صاحب کی زیر تبصرہ کتاب اس دعوے کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے۔ اس مختصر سی کتاب میں عبدالقوی دسنوی صاحب نے ریاست بھوپال سے اقبال کے جذباتی اور مادی تعلق کی تفصیل بڑے دلنشیں انداز میں تحریر کی ہے۔ علامہ اقبال تین بار بھوپال تشریف لائے اور علاج کے سلسلے میں بھوپال میں ان کا قیام تقریباً سوا چار ماہ رہا۔ بظاہر یہ مدت بہت مختصر ہے لیکن اس کتاب کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مختصر مدت اقبال کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ عبدالقوی دسنوی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اقبال کے بھوپال میں قیام کی داستان کو خلوص اور اہتمام سے قلمبند اور شایع کیا۔ اقبالیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ ایک مفید اور قابل قدر تحفہ ہے۔

تبسم غم

مجموعۂ کلام: وسیم بریلوی

قیمت:۔ دو روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ: پاپولر بکس پبلی کیشن، ۱۴۲۹ فراشخانہ۔ دہلی ۶

"تبسم غم" نوجوان شاعر وسیم بریلوی کی غزلوں، نظموں اور قطعات کا مجموعہ ہے۔ وسیم بریلوی کے نام سے شاید وہ لوگ زیادہ آشنا نہ ہوں جو صرف رسائل و اخبارات کا مطالعہ کرتے ہیں لیکن "ادب نواز" حضرات ان کو خوب جانتے ہوں گے جو مشاعرے کرتے یا سنتے ہیں۔ مغربی یوپی اور دہلی کے زیادہ تر مشاعروں میں وسیم صاحب کو ضرور بلایا جاتا ہے اور ان کے کلام کو پسند کیا جاتا ہے۔ مشاعروں میں وسیم کی اس مقبولیت کا سبب صرف ان کی دلکش اور شیریں آواز ہی نہیں بلکہ ان کا پرسوز اور غم انگیز کلام بھی ہے خاص طور سے ان کی غزلیں۔ تبسم غم کے تعارف میں منشور واحدی صاحب نے لکھا ہے کہ "وسیم کی غزلوں میں ایک رکی رکی سی کیفیت ملتی ہے" اس کیفیت کی تہذیب میں وسیم نے اردو غزل کی روایت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن وسیم کو اس کا احساس ہے کہ غزل کی علامتیں محدود ہیں اور "غزل کی مروجہ علائم کی محفل میں جا کر "اپنی بات" کہنا، ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے"۔ اس حقیقت پسندانہ اعتراف کے باوجود وسیم نے "اپنی بات" "اپنے انداز" میں کہنے کی کوشش کی اور انھیں اس میں کافی حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے۔

حیات انھیں ملی جن کو غم حیات نہیں — وہاں چراغ جلے ہیں جہاں پتنگ نہیں

ہنس رہا ہوں کہ لوگ ہنستے ہیں — دل کی حالت کسی کو کیا معلوم

چھوڑ دو تم بھی مجھے سب کی طرح — راستو! میری کوئی منزل نہیں

اس قسم کے اشعار اس مجموعے میں جا بجا ملیں گے۔ نظموں کا حصہ کمزور ہے، ان کو شامل نہ کیا جاتا تو اچھا تھا۔ اس مجموعے کی سب سے اہم چیز وسیم بریلوی کا دیباچہ ہے جس میں انھوں نے بڑی ایمانداری عجز و انکسار اور خلوص کے ساتھ اپنے فن کے ارتقاء کی وضاحت کی ہے اور عام غزل گو شعراء کے برعکس کہیں بھی "برخود غلط" ہونے کا ثبوت نہیں دیا ہے بلکہ اپنی خوبیوں اور خامیوں کی طرف بڑی معصومیت سے اشارہ کیا ہے۔ طباعت اچھی ہے کتابت میں کہیں کہیں کاتب صاحب نے اپنے فن کا بے جا مظاہرہ کیا ہے۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر نصیرالدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپایا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا